ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3910

Program: BS Islamic Studies (Spec. Seerat Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیۂ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ سیرت سٹڈیز)

کورس: سیرت النبی ﷺ قرآن کی روشنی میں (3910) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص سیرت سٹڈیز)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ 1 تا 4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: دینِ مکمل ہونے کے اعلان کے اثرات (20 نمبر)

سوال: دین مکمل ہونے کے اعلان نے امتِ مسلمہ کی دینی ذمہ داریوں، اجتماعی زندگی اور اسلامی معاشرے کی تشکیل پر کیا اثرات مرتب کیے؟ مفصل بحث کریں۔

تمہید و تعارف

سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ قرآن کریم کی روشنی میں کیا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ نبوت کا پورا سلسلہ ایک ایسے دن کی طرف بڑھ رہا تھا جس دن اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل کا اعلان فرمانا تھا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نو ذوالحجہ دس ہجری کو، میدانِ عرفات میں وہ مشہور آیت نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیتِ دین پسند فرمالیا (سورۃ المائدہ 5:3 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ یہ اعلان محض ایک خبر نہیں تھا بلکہ امتِ مسلمہ کی پوری تاریخ کا رخ متعین کرنے والا موڑ تھا۔ اس کے بعد دین میں کسی بنیادی اضافے کی گنجائش باقی نہ رہی، نبی کریم ﷺ کی زندگی کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچا اور امت کو ایک مکمل ضابطۂ حیات دے کر اس کے سپرد کر دیا گیا۔ اس جواب میں ہم اس اعلان کے تین بڑے اثرات کا جائزہ لیں گے: دینی ذمہ داریوں پر اثر، اجتماعی زندگی پر اثر اور اسلامی معاشرے کی تشکیل پر اثر، اور آخر میں اس کی عصری اہمیت بیان کریں گے۔

اعلانِ تکمیلِ دین کا پس منظر

تکمیلِ دین کے اعلان کو سمجھنے کے لیے اس کا پس منظر ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ تیئیس برس کی نبوی جدوجہد میں عقیدۂ توحید کی بنیاد رکھی گئی، عبادات کا نظام قائم ہوا، اخلاقی تربیت مکمل ہوئی، مدینہ میں ایک ریاست اور معاشرہ تشکیل پایا، حلال و حرام کے بنیادی احکام نازل ہوئے اور جہاد، معیشت، خاندان اور بین الاقوامی تعلقات کے اصول مقرر کر دیے گئے۔ حجۃ الوداع میں نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبے میں انسانی جان، مال اور عزت کی حرمت، عورتوں کے حقوق، سود کی ممانعت اور قرآن و سنت کو مضبوطی سے تھامنے کی وصیت فرمائی۔ اسی ماحول میں تکمیلِ دین کی آیت کا نزول گویا اس پورے عمارت نما نظام پر مہرِ تکمیل تھا۔ صحابہ کرام اس آیت کی نزول کی سنگینی کو سمجھتے تھے؛ روایات میں آتا ہے کہ اس کے نزول کے بعد بعض صحابہ نے اسے اس اشارے کے طور پر لیا کہ اب نبی کریم ﷺ کا دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب ہے، اور واقعی اس کے تقریباً اکیاسی دن بعد آپ ﷺ کا وصال ہوا۔ یوں یہ اعلان نبوت کے اختتام اور امت کی خود ذمہ داری کے آغاز کا سنگِ میل بن گیا۔

دینی ذمہ داریوں پر اثرات

تکمیلِ دین کے اعلان کا پہلا بڑا اثر یہ ہوا کہ امت کی دینی ذمہ داریوں کی نوعیت ہمیشہ کے لیے متعین ہو گئی۔ اب قرآن و سنت کی صورت میں ایک مکمل اور محفوظ نصاب موجود تھا، اس لیے امت کی پہلی ذمہ داری اس دین کی حفاظت بن گئی۔ اسی ذمہ داری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو سینوں اور مصاحف میں محفوظ کیا، حدیث کی تدوین اور اسناد کی جانچ کا بے مثل نظام قائم کیا اور اس دین کو بغیر کمی بیشی اگلی نسلوں تک پہنچایا۔ دوسری ذمہ داری دعوت و تبلیغ کی تھی۔ قرآن کریم نے امت کو بہترین امت اس لیے قرار دیا کہ وہ نیکی کا حکم دیتی اور برائی سے روکتی ہے (آل عمران 3:110 کے مفہوم کا خلاصہ)، اور چونکہ سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا تھا، اس لیے یہ ذمہ داری قیامت تک امت کے سپرد ہو گئی۔

تیسری اہم ذمہ داری اجتہاد و استنباط کی تھی۔ دین مکمل ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آئندہ پیش آنے والے ہر نئے مسئلے کا لفظی حکم موجود ہو گا، بلکہ اصول و کلیات مکمل کر دیے گئے تھے اور ان اصولوں کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کرنا اہلِ علم کی ذمہ داری قرار پایا۔ اسی دروازے سے فقہ، اصولِ فقہ اور اجتہاد کے عظیم علوم وجود میں آئے اور اسلام ہر دور کے مسائل کا جواب دینے کے قابل ہوا۔ چوتھی ذمہ داری نبی کریم ﷺ کی سنت کو عملی نمونہ بنانا تھی، کیونکہ قرآن کریم نے آپ ﷺ کی زندگی کو اہلِ ایمان کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا (الاحزاب 33:21 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ یوں امت کی دینی زندگی بدعت و اضافے سے محفوظ اور اصل ماخذ سے جڑی رہی۔

اجتماعی زندگی پر اثرات

اجتماعی زندگی پر اس اعلان کا گہرا اثر یہ پڑا کہ امت کو اپنی شناخت کی مستقل بنیاد مل گئی۔ اب مسلمان کی پہچان نسل، قبیلے، زبان یا وطن سے نہیں بلکہ ایک مکمل دین کی پیروی سے تھی۔ قرآن کریم نے اہلِ ایمان کو ایک دوسرے کے بھائی قرار دیا (الحجرات 49:10 کے مفہوم کا خلاصہ) اور اسی اخوت نے عرب کے جنگجو قبائل کو ایک امت میں ڈھال دیا۔ تکمیلِ دین نے اجتماعی زندگی کو ایک مستقل دستور فراہم کیا جس میں حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی تھی، قانون سب کے لیے یکساں تھا اور امیر و غریب، حاکم و محکوم سب شریعت کے سامنے برابر تھے۔ اسی تصور نے اجتماعی زندگی میں عدل، مساوات اور قانون کی بالادستی کو جڑ پکڑنے کا موقع دیا۔

اس اعلان کا ایک اور اجتماعی اثر اجتماعی خود اعتمادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جب امت کو یقین ہو گیا کہ اس کے پاس اللہ کا پسندیدہ اور مکمل دین موجود ہے تو اس میں ایک تہذیبی اعتماد پیدا ہوا۔ اسی اعتماد کے ساتھ مسلمانوں نے اگلی چند صدیوں میں علم، طب، فلکیات، ریاضی اور فلسفے میں دنیا کی قیادت کی، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ دین انھیں دنیا کی تعمیر سے روکتا نہیں بلکہ اس کا حکم دیتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں شورائیت، عدلِ اجتماعی، کمزور طبقوں کی کفالت اور غیر مسلم شہریوں کے حقوق کے تحفظ جیسے اصول بھی اسی مکمل دین کے دیے ہوئے تھے اور انہی پر عمل نے ابتدائی اسلامی معاشرے کو اپنے دور کا سب سے منظم معاشرہ بنایا۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل پر اثرات

اسلامی معاشرے کی تشکیل کے حوالے سے تکمیلِ دین کا اعلان بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس اعلان نے معاشرے کو عقیدہ، عبادت، اخلاق، معیشت اور سیاست سمیت زندگی کے تمام شعبوں کے لیے ایک متحد فریم ورک دے دیا۔ معاشرہ اب انسانی خواہشات یا بادشاہوں کے فرمانوں کے بجائے وحی کی ہدایت پر قائم تھا۔ فرد اور ریاست دونوں ایک ہی اخلاقی ضابطے کے پابند تھے: حکمران کے لیے عدل اور امانت لازم تھی اور شہری کے لیے قانون کی پاسداری اور اجتماعی بھلائی میں تعاون۔ قرآن کریم نے حکم دیا کہ نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ و زیادتی میں مدد نہ کرو (المائدہ 5:2 کے مفہوم کا خلاصہ) — یہی جملہ اسلامی معاشرے کی سماجی بُنیاد کا خلاصہ ہے۔

جدول: تکمیلِ دین کے اعلان کے نمایاں اثرات

قرآنی بنیاد (حوالہ و مفہوم)	اثر	شعبہ
قرآن کی حفاظت کا الٰہی وعدہ (الحجر 15:9 کا مفہوم)	دین کی حفاظت و تدوین، حدیث و قرآن کی محفوظ ترسیل	دینی ذمہ داری
امت کو امر بالمعروف کی ذمہ داری (آل عمران 3:110 کا مفہوم)	دعوت و تبلیغ قیامت تک امت کی ذمہ داری	دینی ذمہ داری

اہلِ ایمان کی باہمی بھائی چارگی (الحجرات 49:10 کا مفہوم)	نسل و قبیلے کے بجائے دینی اخوت کی بنیاد پر وحدت	اجتماعی زندگی
عدل و احسان کا حکم (النحل 16:90 کا مفہوم)	قانون کی بالادستی، مساوات اور عدلِ اجتماعی	معاشرتی تشکیل
تعاون کا دوطرفہ اصول (المائدہ 5:2 کا مفہوم)	نیکی میں تعاون اور گناہ میں عدم تعاون کا سماجی اصول	معاشرتی تشکیل

یہ بھی واضح رہے کہ تکمیلِ دین کے اعلان نے معاشرے کو جامد نہیں بنایا بلکہ اسے مستحکم بنیادوں پر ہمیشہ ترقی کے قابل بنایا۔ بنیادی عقائد و عبادات و اخلاقی قدریں ناقابلِ تغیر رہیں، جبکہ دنیاوی معاملات میں اجتہاد کی گنجائش نے معاشرے کو ہر دور کے حالات کے مطابق ڈھلنے کی صلاحیت دی۔ یہی توازن اسلام کی بقا کی بڑی وجہ ہے کہ چودہ سو سال کے تغیرات کے باوجود اس کی بنیادی ساخت محفوظ اور اس کا پیغام زندہ ہے۔

نتیجہ

حاصلِ کلام یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ہونے والا تکمیلِ دین کا اعلان امتِ مسلمہ کی تاریخ کا فیصلہ کن موڑ تھا۔ اس نے امت کی دینی ذمہ داریوں کو حفاظتِ دین، دعوت، اجتہاد اور اتباعِ سنت کی صورت میں ہمیشہ کے لیے متعین کر دیا، اجتماعی زندگی کو اخوت، مساوات اور قانون کی بالادستی کی مستقل بنیاد فراہم کی، اور اسلامی معاشرے کو ایک ایسا مکمل ضابطہ دے دیا جس کی روشنی میں ہر دور کا معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔ آج بھی مسلمان معاشروں کی اصل ضرورت اسی مکمل دین کی طرف سچی واپسی ہے: عقیدے میں پختگی، اخلاق میں بلندی، قانون کی پاسداری اور سماجی عدل، تاکہ وہ اثرات آج بھی اسی طرح نمایاں ہوں جس طرح ابتدائی اسلامی معاشرے میں نمایاں تھے۔

سوال نمبر 2: بعثت سے ہجرتِ مدینہ تک کے مراحل اور ان کے اصول (20 نمبر)

سوال: بعثتِ نبوی ﷺ سے ہجرتِ مدینہ تک کے اہم مراحل کو قرآن کریم کی روشنی میں بیان کریں اور ان سے حاصل ہونے والے دعوتی، تربیتی اور معاشرتی اصولوں کو متعین کریں۔

تمہید و تعارف

بعثتِ نبوی ﷺ سے ہجرتِ مدینہ تک کا عرصہ تقریباً تیرہ برس پر محیط ہے اور یہ سیرت النبی ﷺ کا مکی دور کہلاتا ہے۔ یہ دور کسی سلطنت یا فوج کا دور نہیں تھا بلکہ عقیدے کی بنیاد رکھنے، افراد کی تربیت کرنے اور ایک ایسی جماعت تیار کرنے کا دور تھا جو آگے جا کر مدنی معاشرے کی بنیاد بن سکے۔ قرآن کریم کی مکی سورتوں میں اس دور کے تقریباً ہر مرحلے کی جھلک ملتی ہے، کیونکہ یہ سورتیں اسی جدوجہد کے دوران نازل ہوئیں اور ہر موقع پر راہنمائی فراہم کرتی رہیں۔ اس جواب میں پہلے اس دور کے اہم مراحل قرآن کریم کی روشنی میں بیان کیے جائیں گے، پھر ان سے اخذ ہونے والے دعوتی، تربیتی اور معاشرتی اصول متعین کیے جائیں گے۔

پہلا مرحلہ: وحی کا آغاز اور بعثت

اس دور کا آغاز غارِ حرا میں پہلی وحی کے نزول سے ہوا۔ قرآن کریم نے اس واقعے کی طرف سورۃ العلق کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا جن میں پڑھنے کا حکم، قلم کی اہمیت اور اللہ تعالیٰ کے خالق و معلم ہونے کا بیان ہے (العلق 96:1 تا 5 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ ان آیات نے بعد کی پوری دعوت کا رخ متعین کر دیا کہ یہ دعوت جہالت کے مقابلے میں علم کی، اور بے ضابطگی کے مقابلے میں وحی کی ہدایت پر کھڑی ہو گی۔ اس کے بعد سورۃ المدثر میں نبی کریم ﷺ کو اٹھ کر لوگوں کو خبردار کرنے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرنے کا حکم ملا (المدثر 74:1 تا 7 کے مفہوم کا خلاصہ)، گویا ذاتی تیاری کے بعد دعوت کی علانیہ ذمہ داری کا اعلان ہو گیا۔

دوسرا مرحلہ: خفیہ دعوت اور افراد کی تیاری

ابتدا میں دعوت خفیہ رہی اور دارِ ارقم اس کا مرکز رہا۔ اس مرحلے میں وہ افراد تیار ہوئے جو بعد میں اسلام کی بنیاد بنے۔ قرآن کریم نے اس دور کے مسلمانوں کو صبر، نماز اور ذکر کی تلقین کی؛ سورۃ المزمل میں رات کے قیام اور قرآن کی ترتیل سے تلاوت کی جو تربیت دی گئی (المزمل 73:1 تا 6 کے مفہوم کا خلاصہ) وہ آنے والے دباؤ کے مقابلے کی روحانی تیاری تھی۔ اس مرحلے کا بڑا سبق یہ ہے کہ دعوت کا آغاز شور سے نہیں بلکہ گہری انفرادی تربیت سے ہوتا ہے۔

تیسرا مرحلہ: علانیہ دعوت اور مخالفت کا آغاز

تقریباً تین برس بعد جب قریبی رشتہ داروں کو دعوت دینے کا حکم نازل ہوا (الشعراء 26:214 کے مفہوم کا خلاصہ) اور پھر کھلم کھلا اعلان کا حکم آیا (الحجر 15:94 کے مفہوم کا خلاصہ) تو دعوت علانیہ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی قریش کی مخالفت شروع ہوئی: استہزاء، تہمت، سماجی بائیکاٹ، اذیتیں اور شعبِ ابی طالب کی محاصرت اسی دور کی آزمائشیں ہیں۔ قرآن کریم اس پورے دور میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتا رہا کہ آپ سے پہلے رسولوں کو بھی جھٹلایا گیا اور انھوں نے صبر کیا (الاحقاف 46:35 اور الانعام 6:34 کے مفہوم کا خلاصہ) اور یہ بھی فرمایا کہ ہم آپ کا سینہ کشادہ کر چکے ہیں اور آپ کے ذکر کو بلند کر دیا ہے (الانشراح 94:1 تا 4 کے مفہوم کا خلاصہ)۔

چوتھا مرحلہ: ہجرتِ حبشہ، عام الحزن اور طائف

مخالفت شدت اختیار کر گئی تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا کہ جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، اللہ انھیں دنیا میں بھی اچھا ٹھکانا دے گا (النحل 16:41 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ پھر عام الحزن میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کا انتقال ہوا اور طائف کا تلخ تجربہ پیش آیا، مگر قرآن کریم نے مایوسی سے منع کیا اور اللہ کی رحمت کی امید دلائی (الزمر 39:53 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ اسراء و معراج کا واقعہ اسی دور کی بڑی تسلی تھی جس کا ذکر سورۃ الاسراء کی پہلی آیت میں ہوا (الاسراء 17:1 کے مفہوم کا خلاصہ)۔

پانچواں مرحلہ: بیعتِ عقبہ اور ہجرتِ مدینہ

مدینہ کے قبائل سے رابطے کے بعد بیعتِ عقبہ اولیٰ اور ثانیہ واقع ہوئیں اور مدینہ میں دعوت کی بنیاد پڑ گئی۔ بالآخر جب قریش نے نبی کریم ﷺ کے خلاف انتہائی اقدام کی سازش کی تو ہجرت کا مرحلہ آیا جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا کہ کفار آپ کو قید کرنے، قتل کرنے یا نکالنے کی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے (الانفال 8:30 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ غارِ ثور میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے خطاب قرآن کریم میں محفوظ ہے کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے (التوبہ 9:40 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ مدینہ پہنچ کر مکی دور اپنے منطقی نتیجے یعنی اسلامی معاشرے کی تشکیل تک پہنچا۔

جدول: مکی دور کے مراحل اور قرآنی راہنمائی

مرحلہ	اہم واقعہ	قرآنی حوالہ (مفہوم)
بعثت	غارِ حرا میں پہلی وحی	علم و قلم کی دعوت کی بنیاد (العلق 96:1-5)
خفیہ دعوت	دارِ ارقم میں افراد کی تیاری	قیامِ لیل و تربیتِ باطن (المزمل 73:1-6)
علانیہ دعوت	صفا سے اعلان، مخالفت و اذیت	کھلا اعلان اور مشرکین سے اعراض کا حکم (الحجر 15:94)
آزمائش	ہجرتِ حبشہ، شعبِ ابی طالب، طائف	مہاجرین کے لیے اچھے ٹھکانے کی بشارت (النحل 16:41)
تسلّی و تقویت	اسراء و معراج	مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سیر (الاسراء 17:1)
اختتام و آغاز	بیعتِ عقبہ اور ہجرتِ مدینہ	غارِ ثور میں الٰہی معیت کی بشارت (التوبہ 9:40)

حاصل ہونے والے دعوتی اصول

ان مراحل سے دعوت کے کئی پائیدار اصول اخذ ہوتے ہیں۔ پہلا اصول تدریج ہے: دعوت قریبی حلقے سے شروع ہو کر بتدریج پھیلی، داعی نے پہلے افراد بنائے پھر معاشرے کی طرف بڑھا۔ دوسرا اصول حکمت و نرمی ہے؛ قرآن کریم نے دعوت کا طریقہ حکمت، عمدہ نصیحت اور بہترین اندازِ گفتگو بتایا (النحل 16:125 کے مفہوم کا خلاصہ)، اور مکی دور میں ہاتھ روک کر رکھنے اور صبر کی پالیسی اسی حکمت کا حصہ تھی۔ تیسرا اصول داعی کی ذاتی استقامت ہے: داعی سب سے زیادہ آزمائش سہتا ہے مگر اپنے موقف سے نہیں ہٹتا۔ چوتھا اصول ماحول کی موافقت دیکھ کر نئے مرکز کا انتخاب ہے، جیسے حبشہ اور پھر مدینہ کا انتخاب بتاتا ہے کہ داعی حالات کے مطابق تدبیر بدل سکتا ہے لیکن مقصد نہیں بدلتا۔

تربیتی اور معاشرتی اصول

تربیتی اصولوں میں سب سے نمایاں تزکیہ و نماز کے ذریعے کردار سازی ہے۔ مکی سورتوں نے عقیدۂ توحید اور آخرت کے تصور کو اس قدر راسخ کیا کہ مسلمان ہر قربانی کے لیے تیار ہو گئے۔ صبر، ایثار اور برداشت اس تربیت کے نمایاں اوصاف تھے۔ معاشرتی اصولوں میں اہم یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ طاقت سے نہیں، تیار شدہ افراد سے بنتا ہے؛ مدینہ کی ریاست اسی لیے پائیدار ہوئی کہ اس کے پیچھے تیرہ برس کی تربیت یافتہ جماعت کھڑی تھی۔ دوسرا معاشرتی اصول یہ ہے کہ ظلم کے دور میں بھی مسلمان کو فساد اور انتقام کی راہ اختیار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اصلاح کی جدوجہد قانون و اخلاق کے دائرے میں رہ کر کرنی چاہیے۔ تیسرا اصول ہجرت و نصرت کا ہے کہ مظلوم کی مدد کرنا اور اس کے لیے ٹھکانا فراہم کرنا اہلِ ایمان کی اجتماعی ذمہ داری ہے، جو مہاجرین و انصار کے رشتے کی بنیاد بنا۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ بعثت سے ہجرت تک کا مکی دور سیرت النبی ﷺ کا وہ بنیادی مرحلہ ہے جس میں عقیدہ پختہ ہوا، جماعت تیار ہوئی اور دعوت نے ہر آزمائش کے مقابلے میں حکمت و صبر کا نمونہ پیش کیا۔ قرآن کریم اس دور کا ہم سفر راہنما ہے جس نے ہر مرحلے پر اصول دیے۔ آج کے داعیان و مصلحین کے لیے یہ دور مکمل درسگاہ ہے: پہلے خود کو

اور اپنے ساتھیوں کو تیار کرو، دعوت تدریج و حکمت سے دو، مخالفت میں صبر و اخلاق نہ چھوڑو، اور اللہ کی نصرت پر یقین رکھو۔ یہی اصول مکی دور کو ہر زمانے کے لیے زندہ نمونہ بناتے ہیں۔

سوال نمبر 3: بت پرستی کا آغاز، اہلِ مکہ کے عقائد اور قرآن کی حکمتِ عملی (20 نمبر)

سوال: عرب میں بت پرستی کے آغاز کے اسباب اور اہلِ مکہ کے عقائد کا قرآنی تناظر میں تجزیہ کریں اور واضح کریں کہ قرآن کریم نے ان عقائد کی اصلاح کے لیے کون سی حکمتِ عملی اختیار کی؟

تمہید و تعارف

جزیرۂ عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعوتِ توحید کا مرکز رہا ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر ہی توحید کی بنیاد پر ہوئی تھی، لیکن صدیوں گزرنے کے بعد عرب رفتہ رفتہ اس اصل سے دور ہوتے گئے یہاں تک کہ بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت مکہ سمیت پورا عرب بت پرستی میں ڈوبا ہوا تھا اور خانہ کعبہ کے ارد گرد بت نصب ہو چکے تھے۔ قرآن کریم نے اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر عرب کے عقائد کا تجزیہ کیا اور ان کی اصلاح کی ایک ایسی حکمتِ عملی اختیار کی جو محض تنقید نہیں تھی بلکہ ذہن و دل کی تبدیلی کا مکمل پروگرام تھی۔ اس جواب میں پہلے بت پرستی کے آغاز کے اسباب، پھر اہلِ مکہ کے عقائد کا قرآنی تجزیہ اور آخر میں قرآن کی اصلاحی حکمتِ عملی بیان کی جائے گی۔

عرب میں بت پرستی کے آغاز کے اسباب

پہلا سبب اصلِ توحید سے بتدریج غفلت اور دوری تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد نسلیں گزرتی گئیں، دینی علم کی باقاعدہ ترسیل کا نظام باقی نہ رہا اور رسم و رواج اصل دین کی جگہ لیتے گئے۔ دوسرا سبب نیک لوگوں سے عقیدت کا غلو تھا۔ قرآن کریم نے قومِ نوح کے بتوں، یعنی ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، کا ذکر کیا (نوح 71:23 کے

مفہوم کا خلاصہ) جن کے بارے میں مفسرین بیان کرتے ہیں کہ یہ دراصل نیک لوگ تھے جن کی یاد میں پہلے نشانیاں بنیں اور پھر وہی پرستش کی چیزیں بن گئیں۔ عرب میں بھی یہی طرز دہرایا گیا: نیک و مقدس شخصیات یا ان کی قیام گاہوں سے وابستہ پتھر آہستہ آہستہ معبود کا درجہ پانے لگے۔ تیسرا سبب قبائلی رسم و تقلید تھا؛ ہر قبیلے کا اپنا بت اس کی شناخت بن گیا اور باپ دادا کی روش چھوڑنا قبیلے سے [illegible] سمجھا جانے لگا۔

چوتھا سبب تجارتی و سیاسی مفادات تھا۔ مکہ ایک تجارتی مرکز تھا؛ مختلف قبائل کے بت کعبے کے اردگرد ہونے سے تمام قبائل حج و تجارت کے لیے مکہ آتے تھے، اس لیے قریش کے سرداروں کے معاشی مفادات بت پرستانہ نظام سے جُڑ گئے تھے اور وہ اس کی تبدیلی کے خلاف ہو گئے۔ پانچواں سبب دینی تعلیم کی جگہ اٹکل، کہانیوں اور شاعری کا رواج تھا، جس نے توحید کی صاف تعلیم کو قصوں اور توہمات کے پردے میں چھپا دیا۔ یوں بت پرستی کسی ایک وقفے سے نہیں بلکہ غفلت، غلو، تقلید، مفاد اور جہالت کے مجموعی عمل سے پھیلی۔

اہلِ مکہ کے عقائد کا قرآنی تجزیہ

قرآن کریم کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ اہلِ مکہ کا معاملہ سادہ انکارِ خدا کا نہیں تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق، رازق اور کائنات کا مدبر مانتے تھے؛ قرآن کریم بیان کرتا ہے کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ آسمان و زمین کس نے پیدا کیے تو وہ کہیں گے اللہ نے (العنکبوت 29:61 اور الزمر 39:38 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ ان کا اصل انحراف یہ تھا کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرا لیا تھا اور بتوں کو اللہ تک رسائی کا وسیلہ اور سفارشی قرار دیتے تھے، کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں (الزمر 39:3 کے مفہوم کا خلاصہ) اور یہ ہمارے سفارشی ہیں (یونس 10:18 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ گویا ان کا مرض توحیدِ ربوبیت کا انکار نہیں بلکہ توحیدِ عبادت کا فقدان تھا۔

اہلِ مکہ کے دیگر عقائد میں فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینا (النحل 16:57 کے مفہوم کا خلاصہ)، جنات کو اللہ کا شریک ٹھہرانا (الانعام 6:100 کے مفہوم کا خلاصہ)، کہانت و فال گیری پر یقین، اور آخرت کا انکار یا اس میں شدید تذبذب شامل تھے۔ قرآن کریم نے دکھایا کہ وہ آخرت کا انکار اس لیے کرتے تھے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کو عقل

سے بعید سمجھتے تھے اور اپنے دنیوی مفادات کے خلاف پاتے تھے۔ اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی جڑ جہالت سے زیادہ نفسانی خواہش، سماجی دباؤ اور مفاد پرستی تھی، اسی لیے اصلاح کے لیے محض اطلاع کافی نہیں تھی بلکہ ذہن، دل اور معاشرتی رویے تینوں کی تبدیلی درکار تھی۔

قرآن کریم کی اصلاحی حکمتِ عملی

قرآن کریم نے ان عقائد کی اصلاح کے لیے نہایت حکیمانہ اور بتدریج حکمتِ عملی اختیار کی۔ پہلا قدم دلیل و برہان تھا۔ قرآن نے مشرکین سے بار بار سوال کیا کہ بت ان کے لیے کیا نفع یا نقصان کر سکتے ہیں، اور ایک مثال بیان کی کہ جنھیں اللہ کے سوا پکارا جاتا ہے وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو چھڑا بھی نہیں سکتے (الحج 22:73 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات سنا کر قرآن نے عملی بے عقلی کو نمایاں کیا کہ انھوں نے اپنے قوم کے بتوں کو توڑ کر بڑے بت کے کندھے پر کلہاڑا رکھ دیا تھا تاکہ لوگ خود سوچنے پر مجبور ہوں (الانبیاء 21:57 تا 67 کے مفہوم کا خلاصہ)، اور آسمانی اجرام کی پرستش کے جواب میں ان کا وہ استدلال پیش کیا کہ ڈوب جانے والی چیز معبود نہیں ہو سکتی (الانعام 6:76 تا 79 کے مفہوم کا خلاصہ)۔

دوسرا قدم نرم رویہ اور بتدریج دعوت تھا۔ ابتدائی مکی دور میں قرآن نے مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے بھی منع کیا تاکہ وہ ضد میں اللہ کو برا نہ کہیں (الانعام 6:108 کے مفہوم کا خلاصہ)؛ یہ دعوتی اخلاقیات کی بے نظیر مثال ہے کہ اصلاح کا مقصد جیت نہیں بلکہ ہدایت ہے۔ تیسرا قدم کائناتی نشانیوں کی طرف توجہ دلانا تھا: آسمان و زمین، رات دن، بارش اور زندگی کی نشانیاں پیش کر کے بتایا گیا کہ جس خالق کو تم مانتے ہو عبادت بھی اسی کا حق ہے۔ چوتھا قدم آخرت کا تصور مضبوط کرنا تھا، کیونکہ جب انسان کو جوابدہی کا یقین ہو جائے تو سفارشیوں کے سہارے خود بخود کمزور پڑ جاتے ہیں۔ پانچواں قدم عملی متبادل دینا تھا: بت پرستی کی رسوم کی جگہ نماز، ذکر، حج اور قربانی کی اصل ابراہیمی صورت بحال کی گئی تاکہ انسان کی فطری عبادت پسندی خالی نہ رہے بلکہ صحیح سمت پا لے۔

نتیجہ

حاصلِ بحث یہ ہے کہ عرب میں بت پرستی غفلت، غلو، تقلید، قبائلی مفادات اور جہالت کے نتیجے میں پیدا ہوئی، اور اہلِ مکہ خالق کے منکر نہیں بلکہ عبادت میں شریک ٹھہرانے والے تھے۔ قرآن کریم نے ان کی اصلاح کے لیے طعن و تشدد کے بجائے دلیل، حکمت، نرمی، تدریج اور عملی متبادل کی حکمتِ عملی اپنائی اور تیئیس برس میں ایک بت پرست معاشرے کو توحید کے معاشرے میں بدل کر دکھا دیا۔ آج کے دور میں بھی شرک و بدعت اور باطل عقائد کی اصلاح کا یہی قرآنی اسلوب قابلِ اتباع ہے: پہلے سمجھانا، دلیل دینا، اخلاق برقرار رکھنا اور حق کا روشن متبادل پیش کرنا۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مخصوص افراد یا جماعتوں پر دینی احکام کا اطلاق اہلِ علم و مفتیانِ کرام کا کام ہے؛ اس گائیڈ کا مقصد صرف علمی و مطالعاتی تجزیہ ہے۔

سوال نمبر 4: ابتدائی دور میں صبر و استقامت اور اس کا عملی اطلاق (20 نمبر)

سوال: دعوتِ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے صبر و استقامت کا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیں اور موجودہ دور میں ان تعلیمات کے عملی اطلاق پر بحث کریں۔

تمہید و تعارف

دعوتِ اسلام کا ابتدائی مکی دور آزمائشوں کا دور تھا۔ مسلمان اقلیت میں تھے، ان کے پاس نہ حکومت تھی، نہ فوج، نہ معاشی طاقت؛ دوسری طرف قریش کی پوری سماجی و معاشی قوت ان کی مخالفت میں کھڑی تھی۔ اس دور میں مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ صبر و استقامت تھا، اور قرآن کریم اس پورے دور میں اسی صفت کی تعلیم و تربیت دیتا رہا۔ صبر کا مطلب محض خاموشی سے ظلم سہنا نہیں بلکہ حق پر جمے رہنا، مقصد سے نہ ہٹنا اور اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا ہے، جبکہ استقامت کا مطلب حالات کی ہر تبدیلی کے باوجود درست راستے پر قائم رہنا ہے۔ اس جواب میں پہلے ابتدائی دور کے صبر و استقامت کا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے گا اور پھر آج کے دور میں اس کے عملی اطلاق پر بحث کی جائے گی۔

ابتدائی دور کی آزمائشیں: ایک خاکہ

مکی دور کی آزمائشیں کئی اقسام کی تھیں۔ سماجی سطح پر استہزا، تہمتیں، بائیکاٹ اور شعبِ ابی طالب میں تین سال کی محاصرت پیش آئی۔ جسمانی سطح پر کمزور مسلمانوں کو سخت اذیتیں دی گئیں؛ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تپتی ریت پر اذیت دی گئی، آلِ یاسر پر ظلم کی انتہا ہوئی اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اسلام کی پہلی شہید بنیں۔ نفسیاتی سطح پر نبی کریم ﷺ کو جادوگر، کاہن اور شاعر کہہ کر بدنام کرنے کی مہم چلی۔ معاشی سطح پر مسلمانوں کے کاروبار اور روزگار متاثر کیے گئے۔ ان تمام آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں نے نہ تشدد کا جواب تشدد سے دیا، نہ اپنے عقیدے میں کوئی سمجھوتہ کیا۔ یہی وہ صبر تھا جس کی تربیت قرآن کریم نے قدم قدم پر کی تھی۔

قرآنی تعلیمات میں صبر و استقامت

قرآن کریم نے صبر کو ایمان کی بنیادی صفات میں شمار کیا۔ اہلِ ایمان سے کہا گیا کہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (البقرہ 2:153 کے مفہوم کا خلاصہ)، اور یہ بھی بتایا گیا کہ انسان کو خوف، بھوک، مال و جان اور پیداوار کی کمی سے آزمایا جائے گا اور خوشخبری صبر کرنے والوں ہی کے لیے ہے (البقرہ 2:155 تا 157 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ سورۃ العصر میں نجات کی چار شرائط میں ایمان و عملِ صالح کے ساتھ حق کی تلقین اور صبر کی تلقین کو شامل کیا گیا (العصر 103:1 تا 3 کے مفہوم کا خلاصہ)، جس سے معلوم ہوا کہ صبر انفرادی صفت ہی نہیں بلکہ اجتماعی نظامِ تربیت کا حصہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کو خاص طور پر انبیاء کی طرح صبر کرنے کا حکم دیا گیا جنھیں اولوالعزم کہا گیا (الاحقاف 46:35 کے مفہوم کا خلاصہ) اور آخر دم تک استقامت کی ہدایت دی گئی (ھود 11:112 کے مفہوم کا خلاصہ)۔

قرآن کریم نے صبر کا فلسفہ بھی بیان کیا کہ یہ آزمائشیں اتفاقی نہیں بلکہ ایمان کی صداقت کو پرکھنے اور انسان کو پختہ کرنے کا ذریعہ ہیں۔ کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ صرف ایمان کا دعویٰ کر کے چھوڑ دیے جائیں گے اور آزمائے نہیں جائیں گے؟ (العنکبوت 29:2 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ اسی طرح بیان کیا گیا کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے (الانشراح 94:5 تا 6 کے مفہوم کا خلاصہ)، اور صبر کا اصل اجر بے حساب دیا جائے گا (الزمر 39:10 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ پچھلے انبیاء اور ان کے ساتھیوں کے واقعات، خصوصاً

حضرت ایوب علیہ السلام کا صبر اور حضرت یوسف علیہ السلام کی استقامت، مکی دور کے مسلمانوں کے لیے عملی نمونے کے طور پر سنائے گئے۔ یوں قرآن نے صبر کو مایوسی سے نکال کر ایک مثبت، بامقصد اور اجرانگیز رویہ بنا دیا۔

صبر و استقامت کے عملی نمونے

ان تعلیمات کا عملی نتیجہ مسلمانوں کی زندگیوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذیت کے باوجود احد احد کی صدا سے پیچھے نہ ہٹے، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے لوہے کی کنگھیوں کی اذیت برداشت کی مگر دین نہ چھوڑا، اور نبی کریم ﷺ نے طائف کے زخموں کے جواب میں بھی اس قوم کے لیے ہدایت کی دعا کی۔ یہ استقامت کا وہ رخ ہے جو صبر کو انتقام سے الگ کرتا ہے: مسلمان تکلیف سہتا ہے مگر اپنے اخلاق اور مقصد دونوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ اسی صبر کا ثمر یہ ہوا کہ مکی دور کی تربیت یافتہ جماعت نے مدینہ میں مثالی معاشرہ قائم کیا، یعنی صبر وقتی دفاع نہیں بلکہ طویل المدت تعمیر کی بنیاد نکلا۔

موجودہ دور میں عملی اطلاق

آج کے دور میں صبر و استقامت کی تعلیمات کی ضرورت شاید پہلے سے کم نہیں۔ ذاتی زندگی میں بیماری، معاشی تنگی، ناکامی اور خاندانی مسائل پر جزع فزع کے بجائے اللہ پر بھروسے کے ساتھ مسلسل جائز کوشش کرنا ہی قرآنی صبر کا عصری اطلاق ہے۔ سماجی زندگی میں اختلافِ رائے پر برداشت، سوشل میڈیا کے طعن و تشہیر کے ماحول میں اشتعال کا جواب اشتعال سے نہ دینا اور اپنے مؤقف پر دلیل و اخلاق سے قائم رہنا اسی استقامت کی آج کی صورت ہے۔ دینی دعوت و اصلاح کے کام میں فوری نتائج کی جلد بازی کے بجائے طویل اور مسلسل محنت، اور مخالفت میں اخلاقی حدود کی پاسداری، مکی دور کا سب سے بڑا سبق ہے۔

عملی اطلاق کے لیے چند نکات تجویز کیے جاسکتے ہیں: اول یہ کہ عبادت و نماز کو صبر کا ذریعہ بنایا جائے، کیونکہ قرآن نے مدد کے لیے صبر کے ساتھ نماز ہی کو جوڑا ہے۔ دوم یہ کہ مشکلات کو اللہ کی طرف سے تربیت سمجھ کر ان سے سیکھا جائے اور خود احتسابی کی جائے۔ سوم یہ کہ صبر کو بے عملی نہ سمجھا جائے؛ صبر کے ساتھ اسباب اختیار کرنا، تدبیر بدلنا اور

جائز حقوق کے لیے پرامن و قانونی کوشش جاری رکھنا بھی استقامت ہی ہے، جیسے مکی دور میں ہجرتِ حبشہ ایک تدبیر تھی نہ کہ فرار۔ چہارم یہ کہ اجتماعی سطح پر مسلمان معاشروں کو چاہیے کہ وہ مایوسی اور انتشار کے بجائے اصلاح کے طویل منصوبوں پر صبر سے کام لیں، کیونکہ معاشرے دنوں میں نہیں، نسلوں کی محنت سے بدلتے ہیں۔

نتیجہ

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں کا صبر و استقامت کوئی اتفاقی رویہ نہیں تھا بلکہ قرآن کریم کی مسلسل تربیت کا نتیجہ تھا، جس نے آزمائش کو ایمان کی کسوٹی، اللہ کی معیت کا ذریعہ اور بے حساب اجر کا وعدہ قرار دیا۔ اسی صبر نے ایک کمزور اقلیت کو تاریخ کی مضبوط ترین جماعت بنا دیا۔ آج کے مسلمان کے لیے بھی کامیابی کا راستہ یہی ہے: حق پر استقامت، مشکل میں صبر، اخلاق میں پختگی اور نتائج اللہ پر چھوڑ کر کوشش میں تسلسل۔ یہ تعلیمات محض ماضی کی داستان نہیں بلکہ ہر دور کے مومن کے لیے زندہ راہنمائی ہیں۔

سوال نمبر 5: معجزات کے مطالبات اور ایمان کا باہمی تعلق (20 نمبر)

سوال: اہلِ مکہ کے معجزات کے مطالبات قرآنی آیات کی روشنی میں بیان کریں اور واضح کریں کہ قرآن کریم نے معجزات اور ایمان کے باہمی تعلق کو کس انداز میں بیان کیا ہے؟

تمہید و تعارف

نبوت کی تاریخ میں معجزہ ہمیشہ بحث کا موضوع رہا ہے۔ سابقہ انبیاء کو ان کی قوموں کے سامنے حسی معجزات عطا ہوئے، مگر اہلِ مکہ نے نبی کریم ﷺ سے اپنے من پسند معجزات کا مطالبہ کیا اور ہر مطالبے کے بعد ایک نیا مطالبہ کھڑا کر دیا۔ قرآن کریم نے ان مطالبات کو نقل بھی کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے، اور اس پورے مکالمے میں ایمان کی

حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایمان حسی تماشے کا نام نہیں بلکہ عقل و دل کی تسلیم کا نام ہے۔ اس جواب میں پہلے اہلِ مکہ کے مطالبات قرآنی آیات کی روشنی میں بیان کیے جائیں گے، پھر قرآن کریم کا موقف اور آخر میں معجزے اور ایمان کے باہمی تعلق کا قرآنی تصور پیش کیا جائے گا۔

اہلِ مکہ کے معجزات کے مطالبات

قرآن کریم نے اہلِ مکہ کے مطالبات خاصی تفصیل سے نقل کیے ہیں۔ سورۃ الاسراء میں ان کے مطالبات یوں بیان ہوئے ہیں کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ ہمارے لیے زمین سے چشمہ نہ جاری کر دیں، یا آپ کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ نہ ہو جس کے بیچ نہریں بہتی ہوں، یا آپ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دیں جیسا کہ آپ کہتے ہیں، یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے نہ لے آئیں، یا آپ کے پاس سونے کا گھر نہ ہو، یا آپ آسمان پر نہ چڑھ جائیں، اور آپ کے چڑھنے پر بھی ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتاریں جسے ہم پڑھیں (الاسراء 17:90 تا 93 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ ان مطالبات کی بھاگ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ سنجیدہ تلاشِ حق نہیں بلکہ ٹال مٹول اور ضد کی فہرست تھی، کیونکہ اس میں خود ان کا اعتراف شامل ہے کہ کتاب اترنے کے بعد بھی یقین مشکل تھا۔

دیگر مقامات پر بھی اسی نوعیت کے مطالبات نقل ہوئے ہیں: کبھی کہا گیا کہ کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی (الانعام 6:37 کے مفہوم کا خلاصہ)، کبھی کہا گیا کہ اس شخص کے پاس خزانہ کیوں نہیں یا اس کے ساتھ فرشتہ کیوں نہیں، یا کم از کم اس کا باغ ہی ہو جس سے وہ کھائے (الفرقان 25:7 تا 8 کے مفہوم کا خلاصہ)، اور کبھی رسول کو عام انسان کی طرح کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا دیکھ کر اعتراض کیا گیا (الفرقان 25:7 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ ان مطالبات کا مشترکہ مقصد یہ تھا کہ نبوت کو اپنی شرطوں پر پرکھا جائے اور جب شرائط پوری نہ ہوں تو انکار کی بہانہ سازی جاری رکھی جائے۔

قرآن کریم کا جواب اور موقف

قرآن کریم نے ان مطالبات کے جواب میں چند بنیادی اصول واضح کیے۔ پہلا یہ کہ معجزہ اللہ کے اختیار میں ہے، رسول کے بس میں نہیں؛ نبی کریم ﷺ کو کہا گیا کہ آپ فرما دیجیے کہ میرا رب پاک ہے، میں تو صرف ایک انسان اور رسول ہوں (الاسراء 17:93 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ دوسرا یہ کہ گزشتہ قوموں کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ من پسند

نشانیاں دیکھ کر بھی منکرین ایمان نہیں لائے تھے؛ اسی لیے فرمایا گیا کہ ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف یہ امر مانع رہا کہ پہلے لوگ انھیں جھٹلا چکے (الاسراء 17:59 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ تیسرا جواب یہ تھا کہ اگر ان کے مطالبے پر آسمان سے کتاب بھی اتر آئے جسے وہ ہاتھوں سے چھوئیں تب بھی یہ کہیں گے کہ یہ کھلا جادو ہے (الانعام 6:7 کے مفہوم کا خلاصہ)، اور ان کی قسموں کے باوجود نشانی آ جائے تو بھی یہ ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ مسئلہ دلیل کی کمی نہیں بلکہ دل کی ضد ہے (الانعام 6:109 تا 111 کے مفہوم کا خلاصہ)۔

چوتھا اور فیصلہ کن جواب یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کو سب سے بڑا اور دائمی معجزہ خود قرآن کریم عطا ہوا ہے۔ قرآن نے چیلنج دیا کہ اگر تمہیں اس کے بارے میں شک ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ (البقرہ 2:23 کے مفہوم کا خلاصہ)، اور کفار کے مطالبے کے جواب میں کہا گیا کہ کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب اتاری جو انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ (العنکبوت 29:51 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ پچھلے معجزات وقتی اور محدود مشاہدین کے لیے تھے، جبکہ قرآن قیامت تک ہر نسل کے سامنے پیش کیا جانے والا زندہ معجزہ ہے جو عقل و فطرت سے خطاب کرتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے شقِ قمر سمیت بعض واقعات کی طرف اشارہ بھی کیا (القمر 54:1 کے مفہوم کا خلاصہ)، مگر ان کے بعد بھی منکرین نے اسے جادو کہہ کر ٹال دیا، جو خود اس بات کی دلیل ہے کہ معجزہ ضد کو ختم نہیں کرتا۔

معجزات اور ایمان کا باہمی تعلق: قرآنی تصور

قرآن کریم نے ایمان کی تعریف ہی اس طرح کی ہے کہ وہ غیب پر ایمان ہے؛ متقیوں کی پہلی صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں (البقرہ 2:3 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کی بنیاد مشاہدے کی مجبوری نہیں بلکہ دلائل کی روشنی میں آزادانہ تسلیم ہے۔ اگر ہر شخص کے سامنے اس کا من پسند معجزہ پیش کر دیا جائے تو ایمان کا امتحان ہی ختم ہو جائے، کیونکہ مجبوری کا اقرار ایمان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے فرعون کی مثال دی کہ ڈوبنے کے وقت کا ایمان اس کے کام نہ آیا (یونس 10:90 تا 91 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ دوسری طرف قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے؛ رسول کا کام پہنچانا ہے، جسے وہ چاہے گا ہدایت پائے گا (القصص 28:56 کے مفہوم کا خلاصہ)۔

اس تناظر میں معجزے کا صحیح مقام یہ ہے کہ وہ نبوت کی صداقت کی دلیل اور آزمائش مکمل کرنے کا ذریعہ ہے، ایمان کا بدل نہیں۔ جس دل میں تلاشِ حق ہے اس کے لیے قرآن کی آیات، کائنات کی نشانیاں اور نبی کریم ﷺ کی سیرت کافی ہیں، اور جس دل میں ضد ہے اس کے لیے آسمان سے کتاب بھی ناکافی ہے۔ قرآن نے اسی لیے اہلِ مکہ کو بار بار خود قرآن میں غور کی دعوت دی کہ کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے (محمد 47:24 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ یوں قرآن نے معجزے اور ایمان کا تعلق یہ متعین کیا کہ معجزہ عطا کرنا اللہ کا فعل ہے، ایمان لانا بندے کا اختیار و ذمہ داری ہے، اور دونوں کے درمیان واسطہ عقل، فطرت اور دلیل ہے۔

نتیجہ

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اہلِ مکہ کے معجزات کے مطالبات قرآن کریم کے مطابق دراصل حق کی تلاش نہیں بلکہ ہٹ دھرمی اور ٹال مٹول تھے، اس لیے قرآن نے ان کے جواب میں رسول کی بشری حیثیت، گزشتہ قوموں کا تجربہ اور سب سے بڑھ کر قرآن کو بطورِ دائمی معجزہ پیش کیا۔ قرآن نے معجزے اور ایمان کا تعلق اس انداز میں بیان کیا کہ ایمان غیب پر مبنی آگاہ تسلیم ہے، معجزہ دلیل ہے جبر نہیں، اور ہدایت اللہ کی توفیق سے ملتی ہے۔ آج بھی یہ اصول برقرار ہے کہ اسلام کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت قرآن کریم اور سیرتِ نبوی ﷺ کی زندہ حقیقت ہے، جسے سمجھنے کے لیے کھلی آنکھ اور غیر جانبدار دل درکار ہے، نہ کہ نت نئی شرطوں کی فہرست۔